باب سوم

عصر جدید میں عالم اسلام میں ابھرنے والی مختلف شخصیات اور تحریکاتِ اسلامی کا جائزہ

دورِ جمود وانحطاط

تاریخ اسلام میں جس دور کو جمود وانحطاط کا دور کہا جاتا ہے اس کا آغاز تیرہویں صدی میں منگولوں کے حملوں سے شروع ہوتا ہے اور کوئی پانچ سو برس تک قائم رہتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لئے معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور عملی زوال کا دور تھا۔ اسی دور کی طرف علامہ اقبال اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "During the last five hundred years religious thought in Islam has been practically stationery. There was a time, when European thought recieved inspiration from the world of Islam."[1]

دراصل امام غزالی، ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ملتِ مسلمہ میں اب کوئی فلسفہ دان یا مصلح ملت و مجتہد اعظم ایسا نظر نہیں آرہا تھا جو نظری و عملی اجتہاد کے ذریعے ملت مسلمہ میں نئی روح پھونک دیتا۔ اسلامی روح مردہ ہوجانے کے سبب ہی ملتِ مسلمہ اب طرح طرح کی اخلاقی بداعمالیوں میں مبتلا ہوگئی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اسلام جس کی بنیاد خالص توحید پر ہے اور جس میں شرک و بدعت سے بڑھ کر کوئی اور گناہ نہیں اب عجمی تصوف اور غیر اسلامی نظریات کی آمیزش کی وجہ سے شرک و بدعت کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں عالم اسلام اٹھارہویں صدی تک پوری طرح مبتلا ہو چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری دور میں ہی ہمیں شرک و بدعت اور جمود وانحطاط کے یہ بادل کچھ چھٹتے نظر آتے ہیں اور حرکت و بیداری کے یہ آثار اس وقت نمایاں ہونے لگے جب عالم اسلام پر مغرب کے سیاسی و تہذیبی حملے تیز ہونے لگے۔ اس تصادم کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں کئی طرح کی سیاسی، اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں رونما ہوئیں جن سب کا مشترکہ نقطہ باب اجتہاد کا کھولنا اور قرونِ وسطیٰ کے اجماع اور تقلید کو ختم کرنا تھا۔

ان سیاسی ، اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں میں محمد بن عبدالوہاب کی سلفی تحریک کا نام سرفہرست ہے۔

سلفی تحریک:

محمد بن عبدالوہاب سلفی تحریک کے موجد مانے جاتے ہیں۔ آپ ۱۷۰۳ء میں سعودیہ کے شہر عینیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنے والد عبدالوہاب کی زیر تربیت ہی نشو ونما پائی۔ دس سال کی عمر ہی میں قرآن شریف حفظ کیا۔ آپ تکمیل تعلیم کے فوراً بعد مسلمانوں میں پھیلی ہوئی متعدد برائیوں اور بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑے۔ آپ نے مسلمانوں کو کتاب وسنت کی خالص تعلیمات کی طرف بلایا۔ توحید خالص کی دعوت دیکر انہیں قبروں اور انسانوں سے مدد مانگنے اور مرادیں چاہنے سے روکا۔ ۱۸۵۸ء میں نجد کے ایک شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے کا عہد کر کے خالص کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ امیر بن سعودیہ کی سرکاری معاونت سے محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک سارے نجد میں پھیل گئی اور اس طرح ایک محدود علاقے ہی میں سہی، ذہنی جمود کا یہ طلسم ٹوٹنے لگا۔ دراصل یہی اسلامی نشاۃ ثانیہ کی علامت تھی۔ یہ اس حقیقت کی بھی علامت بن گئی کہ تہذیب اسلامی مردہ نہیں ہو چکی تھی البتہ نیم جان بن گئی تھی۔ برسوں کے جمود نے اس تہذیب کو آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ اس لئے محمد بن عبدالوہاب نے اجماع وتقلید کی مخالفت کی اور باب اجتہاد پھر سے کھولے جانے کی پرزور حمایت کی۔[۲] آپ احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ آپ نے ابن تیمیہؒ اور احمد بن حنبلؒ کی طرح معتزلہ کے استدلالی ہومانزم (Humanism) کو یکسر مسترد کر دیا اور ملت کو خالص قرآن وسنت رسول ﷺ کے

طریقے کو اپنانے پر زور دیا اور قرآن کی صوفیانہ تفاسیر اور موشگافیوں کے برعکس متن کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی۔

شرعی مسایل میں محمد بن عبدالوہاب حنبلی مسلک کے پابند تھے مگر ان کے اندھے مقلد بھی نہ تھے۔ اس بارے میں ''ہسٹری آف مسلم فلاسفی'' کے یہ سطور قابل توجہ ہیں:

"Although the Shaikh was a follower of the Hanbalite School of Fiqh, yet he did not follow it rigidly. In his book Hadyat al-Saniyyah, he makes a frank confession of this. "Imam ibn Qayyim and his illustrious teacher Ibn Taimiyyah," observes he, "were both righteous leaders according to the Sunni school of thought and their writings are dear to my heart, but I do not follow them rigidly in all matters."[3]

دراصل محمد بن عبدالوہاب کی تحریک مغرب کی سیاسی وتہذیبی بالادستی کے اثر سے نہیں اُبھری بلکہ تہذیب اسلامی کی اپنی ہی داخلی کشمکش کے سبب تصادم کی یہ نئی صورت ظہور پذیر ہوئی۔ ابن عبدالوہاب کی اس اصلاحی و اجتہادی تحریک کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ گرچہ تصوف اور راسخ العقیدتی کے خلاف اس کی شدّت پسندی نے اسے زیادہ بڑھنے نہ دیا لیکن اپنے بنیادی چیلنج کے لحاظ سے یہ عالم اسلام میں کامیاب رہی کیونکہ اس نے مسلم معاشرے کے مقید و منجمد پانی میں جو ایک سنگ احتجاج پھینکا تھا اس سے اس میں ایک زندگی بخش اور تازہ کار ارتعاش پیدا ہوا۔ جس سے دھیرے دھیرے پوری دنیائے اسلام متاثر ہوئی اور پھر اسی تحریک کے اثر سے ہی جمال الدین افغانی کی بین الملّیت تحریک، سنوسی تحریک، الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی وغیرہ منصۂ شہود پر آگئیں۔

پچاس سال تک تبلیغ و اصلاح کا کام انجام دیکر آپ آخر ۱۷۹۲ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

شیخ احمد سرہندیؒ:

محمد بن عبدالوہاب سے تقریباً نصف صدی قبل برصغیر ہند میں اسلامی اصلاحی تحریک

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ متوفی ۱۵۳۴-۱۶۲۵، نے شروع کی۔ آپ کو مجدد الف ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ اسلام کے دوسرے ہزار سالہ دور میں صدر اول کے اسلام کا احیاء کرنے والے تھے۔ اس اعتبار سے حضرت شیخ سرہندیؒ کی تحریک محمد بن عبدالوہاب کی سلفی تحریک کے اصلاحی وتجدیدی نظریات کی پُرزور نقیب تھی اور یوں یہ دونوں تحریکیں اپنے مقصد میں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ البتہ مجدّد الف ثانیؒ کی تحریک سلفی تحریک سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ محمد بن عبدالوہاب نے تصوف کو کلیتاً مسترد کر دیا تھا جبکہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے اپنی احیاء ماضی کی تحریک میں نقشبندی سلسلہ تصوف کو بنیاد بنایا تھا۔ محمد بن عبدالوہابؒ کی طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نزدیک بھی شریعت اور اس کے اتباع کا مفہوم بالکل ویسا ہی تھا جیسا امام احمد بن حنبلؒ اور اہل الحدیث کا رہا ہے۔ ان کے یہاں بھی استحسان، مصالح مرسلہ، مقامی رسم ورواج، سماجی قوانین اور عرف وعادات وغیرہ کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ شیخ احمد سرہندیؒ کے نزدیک روزمرہ کے معمولاتِ زندگی اور معمولی سے معمولی معاشرتی معاملات میں بھی شریعت کی حرف بہ حرف پابندی لازمی تھی۔

دراصل سترہویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے آپ کی تحریک ایک زبردست ذہنی، معاشرتی، اور سماجی بیداری کی علامت تھی۔ اسی تحریک کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے ہندوانہ رسم ورواج جو مسلمانوں میں اکبر بادشاہ کے آزادانہ مذہبی خیالات سے در آئے تھے، ان کا سدباب ہوگیا اور مسلمانانِ ہند میں اسلامی تشخص کی حفاظت کا جذبہ پھر سے بیدار ہوگیا۔ علامہ اقبالؒ انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"…. a great religious genuius of the seventeenth century- Sheikh Ahmad of Sarhand- whose fearless analytical criticisim of contemporary sufism resulted in the development of a new technique. All the various systems of sufitechnique in India came from Central Asia and Africa; his is the only technique which

crossed the Indian border and is still a living force in the Punjab, Afghanistan, and Asiatic Russia."[4]

دراصل مجدد الف ثانیؒ نے دو اہم کام انجام دیئے۔ ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے پاک کر کے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا۔ دوسرے یہ کہ ان تمام رسوم جاہلیت کی زبردست مخالفت کی جو اس وقت برصغیر کے مسلمانوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ بہرحال ۶۲ سال کی عمر پا کر آپ ۱۵۳۴ء میں انتقال کر گئے۔

محدّث دہلوی شاہ ولی اللہؒ:

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی تمام تر صلاحیت اور توانائی برصغیر ہند میں تصوف کی اصلاح و تطہیر اور مسلمانانِ ہند کو غیر اسلامی طور طریقوں سے روکنے میں صرف ہوگئی۔ اس لئے ان کے یہاں علمی سطح پر تقلید، اجماع اور اجتہاد کے اہم ترین مسائل پر نہایت کم مواد ملتا ہے لیکن اللہ کے فضل و احسان سے ہند میں آپ کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک عظیم مصلح ملت اور مفکر و مجتہد شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے۔ آپ دہلی کے ایک جلیل القدر علمی و روحانی خانوادے میں ۱۷۰۲ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے صرف چار سال پہلے تولّد ہوئے۔ آپ کا مشہور نام ولی اللہ بن عبدالرحیم ہے۔ مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے برصغیر میں جو مذہبی اور سیاسی اصلاح کا کام شروع کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اسی کام کی رفتار تیز تر کر دی۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے دور میں اسلام کے روحانی انحطاط کو روکنے کے لئے الف ثانیؒ کی شروع کردہ تحریک کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان کے متصوفانہ روحانی ورثہ کے چشموں کو روایتی اسلام کی رود بار میں داخل کر دیا۔ اپنی تبلیغات اور تصنیفات سے شاہ ولی اللہؒ نے یہی کوشش کی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوتا کہ وہ پھر سے برصغیر میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں اور دوسری طرف وہ

ان کی اخلاقی خرابیوں کو دور کر کے انہیں صدر اول کے مسلمانوں جیسی خصوصیات کا حامل بنانا چاہتے تھے۔

شاہ ولی اللہؒ کے یہاں علمی کارناموں کا دائرہ کافی وسیع ہے اور مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف بحیثیت سماجی مصلح کی حیثیت سے تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے رہے اور دوسری طرف ایک عظیم سیاسی مبصر کے طور پر اپنے گردوپیش کے سیاسی حالات وواقعات کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک طرف معاشی ومعاشرتی اصلاحات کے داعی رہے اور دوسری طرف برصغیر میں انہوں نے اجتہاد پر از سرنو زبردست زور دے دیا۔ اس سلسلے میں وہ بالعموم پہلے ہندوستانی عالم دین سمجھے جاتے ہیں جنہوں نے اپنے اندر اجتہاد کا زبردست جذبہ محسوس کیا ہے۔ سید محمد حسین جعفری کے مطابق ''شاہ صاحب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام کی ان معدودے چند فکر انگیز ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے قوانین شریعت، فقہ کے ارتقاء اور اسلامی اقدار کو عمرانی آفاقی اور تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس میں بحیثیت مجموعی ہم آہنگی اور ارتباط کی اکثر کمی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی یہ بات بہت اہم ہے کہ اٹھارہویں صدی کے ایک عالم دین نے ان مسائل پر غیر روائتی انداز میں غور وفکر کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً فقہ اسلامی کے ارتقاء اور قوانین میں شریعت کے فلسفے میں وہ عمرانی اصولوں کے پیش نظر رسم ورواج اور مختلف قوموں اور زمانوں کی مروّجہ عادات وخصائل کو اساسی حیثیت دیتے ہیں''۔ ۵

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی گرانقدر تصنیفات مثلاً ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید''، ''ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء''، ''التفہیمات الالٰہیہ اور حجۃ اللہ البالغۃ'' وغیرہ میں بڑے جرأت مندانہ اور مجتہدانہ انداز میں دین وشریعت کے فلسفے، قوانین شریعت وفقہ کے ارتقاء واستنباط کے اصول اور اجماع، تقلید اور اجتہاد جیسے اہم ترین مسائل کی

تشریح اور تعبیر نو کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اُن کے مجتہدانہ افکار و نظریات پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے:

"Perhaps the first Muslim (thinker) who felt the urge of a new spirit in him was Shah Wali ullah of Delhi."[6]

شاہ ولی اللہؒ ہر زمانے اور ہر وقت کے لئے اجتہاد کو واجب سمجھتے ہیں چاہے وہ اجتہاد منتسب ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے یہاں اجتہاد بجائے خود تقلید کی نفی ہے۔ لہٰذا جب تقلید کے بجائے ہر دور میں نیا اجتہاد ہوگا تو پہلے کے تمام اجماع خود بہ خود ختم ہو جائیں گے اور نئے اجتہاد پر نیا اجماع ہوگا۔

درحقیقت محدّث دہلوی کے مندرجہ بالا اجتہادی افکار برصغیر کی تاریخ فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں انتہائی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ نہ صرف بعد کی اسلامی تحریکیں ان کے ان افکار سے متاثر ہوئیں بلکہ بڑی حد تک ان ہی کے افکار و نظریات ان تحریکات کا سرچشمہ بنے۔ شاہ صاحب نے ۶۲ سال کی عمر پا کر آخر ۲۱ اگست ۱۷۶۲ء میں اس دنیا سے انتقال فرمایا۔

سنوسی تحریک:

الجزائر کے مشہور عالم دین سید محمد بن علی السنوسی الجزائر کے شہر مستغانم میں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دور میں الجزائر، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی لحاظ سے زبردست زوال کا شکار ہو گیا تھا۔ آپ ایک علمی اور خدا پرست خاندان میں پروان چڑھے۔ آپ کی پہلی معلّمہ آپ کی پھوپھی سیدہ فاطمہ تھیں۔ ان کی زیر تربیت سنوسیؒ نے کم سنی میں ہی قرآن مجید حفظ کر کے دینیات اور فقہ کی تعلیم علاقہ کے ماہر علماء اور فقہاء سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے مشہور یونیورسٹی جامعہ قیروین میں داخل ہو کر جید علماء و اساتذہ سے قرآن، حدیث، فقہ اور

عربی زبان وادب پر عبور حاصل کیا۔ بعد میں آپ نے مراکش، تونس، لیبیا اور مصر وغیرہ میں اپنی علمی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاحی اسلامی تحریک شروع کی۔

سنوسی تحریک کا مقصد خالص کتاب وسنت کی اساس پر عالم اسلام کا مکمل دینی احیاء تھا۔ اس سلسلے میں آپ زیادہ تر امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ، اور امام ابن تیمیہؒ کی تعلیمات و اصلاحات دین سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالباً عرب کے مجدد محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک سے بھی آپ زبردست متاثر تھے۔ کیونکہ دونوں مجدّد یکساں مقاصد، امنگیں اور نظریات رکھتے تھے۔ تاہم تصوف کے بارے میں سنوسی تحریک کا رویہ سلفی تحریک سے بالکل مختلف اور مودّبانہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ خالص اسلامی تصوف کے حامل نظر آتے ہیں اور غیر اسلامی تصوف جس میں سماع اور وجد وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو آپ کسی بھی دوسری خلافِ شریعت عمل کی طرح سخت ممنوع قرار دیتے ہیں۔

آپ کی تعلیمات میں اولیاء کی پرستش، مزارات کی زیارت، کافی، تمباکو کا استعمال، یہودیوں اور عیسائیوں سے تعلقات ممنوع ہیں۔ مصر سے لیکر مراکش تک اور ساحل طرابلس سے لیکر صحرائے افریقہ کے آخری کونوں تک سنوسی تحریک پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف افریقہ کے علاوہ، عرب، عراق اور جزائر ملایا تک اس تحریک کے گہرے نقوش ثبت ہو گئے ہیں۔ خصوصاً گالا بٹسٹی، اور بورکو کے علاقوں تک آپ نے اسلام کی نئی روح پھونک دی۔[۷]

اس تحریک کا مقصد عظیم یہی تھا کہ مسلمانوں کے اخلاق و عادات میں اس حد تک اصلاح کی جائے کہ وہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح بن جائیں۔ سنوسی تحریک کی وجہ سے ہی مغربی افریقہ کے صحراؤں اور جنگلوں میں بسنے والے لاکھوں نیم وحشی باشندوں نے اسلام قبول کر کے مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں کی طرح اپنی زندگی گزارنی شروع کی۔ مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ انہوں نے جامد تقلید پسندی کی زبردست مذمت کر کے اجتہاد پر

زور دے دیا ہے۔ سنوسی تحریک آگے چل کر نہ صرف اخلاقی اصلاحی تحریک ہی تک محدود رہی بلکہ انہوں نے زمامِ اقتدار ہاتھ میں لیکر سیاست کا میدان بھی مارا۔ یہاں تک کہ پورے وسطی افریقہ کا سیاسی اقتدار ان کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں اس تحریک کا زوال اس وقت شروع ہوا جب فرانس نے یہ محسوس کیا کہ سنوسی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ نے اس کے استعماری مفادات پر کاری ضرب لگادی۔ اس لئے اس نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے وسطی افریقہ میں وسیع پیمانے پر فوجی کاروائی شروع کی اور بالآخر انتہائی جنگ وجدل کے بعد ۱۹۱۹ء میں سنوسیوں کو شکست ہوگئی۔

سنوسی تحریک قرآن کو ماخذ مانتے ہوئے قیاس اور اجماع کو ثانوی درجہ دیتے ہیں اور اجتہاد کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتے ہیں جبکہ اس زمانے میں علماء وفقہاء اجتہاد کے دروازوں کو ہمیشہ کیلئے مقفل تصور کرتے تھے۔ اس لئے وہ ان کے زبردست مخالف ہو گئے۔ اس حقیقت کی پردہ کشائی اُردن کے ایک اسکالر محمد خلیل یوں کرتے ہیں:

> "The most courageous stand which the Great Sanusi took in this connection was his recognition of *ijtihad* (independent reasoning) as a method for understanding and developing Islam. It was in fact this doctrine which evoked the hostility of the *'Ulama* of the time in Egypt and the *Hijaz* and made him stand at variance with them; for many centuries before, it was considered that the door of *ijtihad* had been closed, and the *'Ulama*, therfore, held that the advocacy of this method was likely to lead the innovations in Islam"8

دراصل محمد بن عبدالوہاب، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہؒ کی تحریکوں کی طرح سنوسی تحریک بھی خالص مذہبی اصلاحی تحریک تھی۔

سید جمال الدین افغانیؒ: سید جمال الدین افغانیؒ افغانستان کے ایک گاؤں کنر میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی انہیں اپنے والد سید صفدر کے ہمراہ کابل

میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ پھر دس سال کے بعد حاکم وقت امیر دوست محمد خان کے حکم سے ہی واپس اسعد آباد آئے اور وہیں رہنے لگے۔

دراصل اسلامی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل سید جمال الدین افغانیؒ ہی نے ڈالی کیونکہ آپ سے بڑھ کر عالم اسلام کی کسی شخصیت نے معاصر تاریخ پر اتنا اثر نہیں ڈالا۔ افغانیؒ ملت اسلامیہ کی فکری و سیاسی بیداری کے شیدائی تھے۔ وہ مغربی سامراجیت کے خلاف مسلمانوں کو بیدار کر کے انہیں متحد و منظّم دیکھنے کے متمنی تھے۔ اس لئے ان کے خیال میں عالم اسلام کی سیاسی آزادی کو مغربی جہانگیری کے خطرے سے تحفظ دینے کے لئے ایک مضبوط و متحد قیادت کی اولین ضرورت تھی۔

افغانیؒ نے اپنا زیادہ وقت جلاوطنی اور سیر و سیاحت میں گزارا۔ انہیں مستقل طور پر کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیا گیا مگر پھر بھی انہوں نے اپنی اہم ترین تصانیف اور خطبات کے ذریعے مسلمانان عالم کو متحد و منظّم رہ کر مغربی سامراجیت کے خلافت نبرد آزما ہونے کا درس دیا۔ علامہ افغانیؒ ملتِ اسلامیہ کو عالمگیر خلافت کے پرچم تلے اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اجتماعی طور پر سیاسی قوت، اقتصادی خوشحالی اور سائنسی و فنی مہارت حاصل کر کے سامراجی طاقتوں سے مقابلہ کر سکیں۔ آپ کی قابل قدر تصانیف میں ''الوحدۃ الاسلامیہ'' ایک اہم ترین تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس میں وہ مسلمانوں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ جس دین حنیف کے پیرو ہیں وہ آپ کو منظّم و متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں وہ ایک جگہ مسلمانوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

"الاقاتل الله الحرص على الدنيا ولتهالك على الخائس ماأشد ضر رهماو مااسوأ أترهما نبذوا كلام الله خلف ظهورهم و جهدوا فرضاً من اعظم فرائضه فاختلفو اولعدو على ابولبهم و كان الواجب عليهم

ان یتحدوا فی الکلامة الجامعة حتی یدفعوا غارة الاباعد عنهم ثم لهم بعد ذالك أن یعودوا الی شئونهم"[9]

اپنے مشہور و معروف عربی جریدے "العروۃ الوثقیٰ" میں وہ ملت اسلامیہ کو ان سے چھینا گیا خطہ ارضی از سر نو فتح کرنا ان کے لئے دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اب اگر مسلمانوں کے لئے یہ ممکن نہ ہو تو پھر دشمنوں کے مفتوحہ علاقہ کو دارالحرب سمجھ کر وہاں سے دارالاسلام میں کسی مقام کو ہجرت کرنے کے لئے ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح اسلام کے انحطاط اور زوال کا سبب وہ یہی جانتے تھے کہ مسلمان سیاسی طور پر مغلوب ہیں اور اس لئے وہ گھٹ کر محض بے لچک دینی عقائد کا مجموعہ بن کے رہ گیا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان احیاء کے لئے ضروری اصول حرکت سے عاری ہیں، یعنی اجتہادی روح سے خالی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق چونکہ اب مختلف خطوں کے علماء و فقہاء کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا ہے اور ایک مسلم ملک کے عوام دوسرے مسلمان ملک کے متعلق معلومات نہیں رکھتے ہیں۔ یہی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔ افغانیؒ اس بے چینی اور بیماری کا سبب عباسیوں کی سیاسی اولوالعزمیوں کو سمجھتے تھے جنہوں نے خلافت اور مذہبی افکار کی تحریک یعنی اجتہاد کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ تقسیم خلفاء راشدین کے اصول و اعمال کے بالکل متضاد تھی۔ ان کے نزدیک اسی تقسیم سے اسلام میں مختلف فرقہ بندیاں اور بدعتیں وجود میں آئیں۔

علامہ افغانیؒ نے اس کا حل یہ تجویز کیا کہ علمائے اسلام مختلف سرزمینوں میں علاقائی مراکز قائم کریں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعہ عوام کی رہنمائی کریں۔ یہ علاقائی مراکز ایک آفاقی مرکز سے منسلک ہوں جو مقامات مقدسہ میں کسی ایک جگہ قائم کیا جائے جہاں مختلف مراکز کے نمایندوں کا اجتماع ہو اور اس میں یہ کوشش کی جائے کہ اجتہاد متفقہ طور پر ہو تا کہ احیاء امت از سر نو ہو سکے اور بیرونی جارحیتوں کا مقابلہ کرنے کی

تیاری کی جا سکے"[10]

دراصل جمال الدین افغانیؒ کے بین اسلامیت (Pan-Islamism) کے خیالات کا تاریخ اسلام کی احیاء پسندی سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ یہ ایک ایسا رجحان تھا جس کی جانب انیسویں صدی کے آخری تین عشروں میں ہندوستانی مسلمان بالخصوص اور عالم اسلام بالعموم راغب ہو گئے۔ سید افغانیؒ کے انہی بیش بہا علمی، فکری اور اصلاحی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر عثمان امین انہیں بہترین طور خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"If Mohammad bin Abdul Wahab of Arabia and Shah Wali Allah of the Indo-Pakistan subcontinent, be considered to be precuresors of the modern awakening in Islam and their movements, the signs ofthe coming dawn, Jamal ud-Din Afghani must be takento be the formost leader of this awakening and his movements the first glow of the dawn."[11]

درحقیقت سید افغانیؒ کسی ایک ملک یا قوم کے رہنما نہیں تھے بلکہ وہ پوری اسلامی دنیا کے رہبر و رہنما تھے۔ وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ میں ایسی پہلی ہستی ہے جس نے دنیائے جدید کے اجتماعی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کرنے کا راستہ بتایا اور قدیم و جدید انداز فکر کو ملا کر ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی اندازِ فکر کی بنا ڈالی۔ بے شک انہیں زمانۂ حاضرہ سے اسلام کے تصادم کی مہم کا پورا پورا اندازہ تھا۔ اقبالؒ اسی لئے خطبات میں آپ کی افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"The man, however, who fully realized the importance and immensity of the task, and whose deep insight into the inner meaning of the history of Muslim thought and life, combined with a broad vision engendered by his wide experience of men and manners, would have made him a living link between the past and the future, was Jamal ud-Din Afghani. If his indefatigable but divided energy could have devoted itself entirely to Islam as a system

of human belief and conduct, the world of Islam intellectually speaking, would have been on a much more solid ground today."12

علامہ اقبال کے خیال کے مطابق علامہ افغانیؒ کو اسلامی فکر کی تاریخ اور زندگی کے مختلف النوع مفہومات کے بارے میں پوری جانکاری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں وہ بصیرت بھی اللہ نے ودیعت کر رکھی تھی جس کے ذریعے وہ آسانی سے ماضی اور مستقبل کے درمیان مضبوط رابطہ فراہم کر سکتے تھے۔ اقبال اسی لئے تمنا کرتے ہیں کہ کاش افغانی نے اپنی تمام تر صلاحیت اور قوّت اسلام کے نظام عقیدہ و عمل کی ترویج پر مرکوز کی ہوتی تو آج عالم اسلام فکری محاذ پر زیادہ مضبوط بنیادوں کا حامل ہوتا۔ افغانیؒ بیک وقت ادیب، خطیب، صحافی اور سب سے بڑھ کر مفکر مسلمان سیاست دان تھے۔ وہ اقبال ہی کی طرح مکہ معظّمہ کو اسلام کا مرکز خیال کرتے تھے۔ اقبال کو جمال الدین افغانی سے اس قدر قلبی و نظریاتی لگاؤ تھا کہ ''جاوید نامہ'' میں جب وہ تصوراتی اسلامی مملکت کا نقشہ پیش کرتے ہیں تو افغانی ہی کو ذریعۂ اظہار بناتے ہوئے اُن کے متعلق کہتے ہیں۔

سید السادات مولٰینا جمال
زندہ از گفتارِ او سنگ و سفال

جمال الدین افغانی کے خیال کے مطابق مسلم اقوام کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) دو باتوں میں مضمر ہے۔ ایک مغرب کی غلامی سے نجات دوم اتحاد اسلامی۔ یہ دونوں حقیقتیں انہوں نے اپنی تصانیف میں واضح طور پر بیان کی ہیں۔

سید جمال الدین افغانی کی یہ دلّی تمنا تھی کہ اسلامی ممالک بے شک اپنی جغرافیائی اور ثقافتی انفرادیتیں برقرار رکھیں مگر ان سب ممالک کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے اور ان بکھرے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کو ملت واحدہ بنانے کے لئے مجلس اقوام کے انداز کی ایک مجلس ممالک اسلامیہ وجود میں آئے جس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو فکری یک جہتی،

ہم آہنگی، باہمی تعاون اور بھائی چارے کا منشور دیا جائے جو فکری منشور خالص تعلیماتِ قرآن وحدیث پر مشتمل ہو۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے اپنی ساری توانائی اور صلاحیت وقف کی یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں قسطنطنیہ میں عالم اسلام کے اس عظیم سپوت کا انتقال ہوا۔

شیخ محمد عبدہ:۔

شیخ محمد عبدہ ۱۸۴۹ء میں ایک مصری زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ جمال الدین افغانی کے عزیز شاگرد اور ہمعصر رہے ہیں۔ ۱۸۶۴ء میں دونوں نے پیرس میں مشترکہ طور پر عربی کا مشہور ہفتہ روزہ ''العروۃ الوثقیٰ'' نکال کر اپنے اصلاحی پروگرام کی وسیع پیمانے پر تشہیر کرائی لیکن جمال الدین افغانی کے برعکس آپ عصری سیاست سے یکسر کنارہ کش رہے اور اپنی تمام تر توجہ اجتہاد و اصلاح پر مرکوز کی۔ دراصل عصر حاضر میں آپ لبرل اصلاحی تحریک کے روح رواں ثابت ہوئے۔ مفتی محمد عبدہ کے مطابق اسلام کے اصولوں کی نئی تشریح و تعبیر اسی صورت میں ممکن ہے جب مذہبی اصلاح کے پروگرام کو جذباتیت اور انقلابی سیاست سے الگ رکھا جائے۔

جس دور میں عبدہ نے اپنی تجدیدی تحریک کا آغاز کیا درحقیقت اس دور میں مصر بڑی تیزی سے یورپ کی تقلید پرستی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ترکی اصلاحات کے تیسرے دور سے گذر رہا تھا۔ اور مصر میں مغربی تہذیب و تمدن کے سرخیل خدیو اسمٰعیل کی حکومت قائم تھی۔ مغربی تہذیب کی مرعوبیت سے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ بھی مغربی روایات ہی کو من وعن قبول کرنے پر زور دیتا تھا۔

عبدہ کے نزدیک مسئلے کا حل قطعاً مغربی تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید میں نہ تھا۔ البتہ وہ ان تبدیلیوں کی جانب جو مصر میں رونما ہو رہی تھیں ہمدردانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ وہ

جدید اداروں کو مصر کی ترقی کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے لیکن اس بات سے بھی خائف تھے کہ مصر کے اسلامی معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا انجام یہ نہ ہو کہ مصری معاشرہ شریعت اسلامیہ کے دائرہ سے خارج ہو جائے۔ اسی لئے ان کا خیال یہ تھا کہ شریعت کے اندر رہ کر یہ تبدیلیاں اور یہ لچک پیدا کر دی جائے تا کہ جدید اقدار اور اداروں کو یہ اپنے اندر سمو سکے۔ اسی مقصد کے تحت وہ احیائے اجتہاد چاہتے تھے۔ وہ علمائے جدید کی ایک ایسی جماعت تشکیل دینا چاہتے تھے جو اجتہاد کے ذریعے نئے مسائل کا حل پیش کرے اور زندگی کے ان اقدار کو جو امت کی بقاء و ترقی کے لئے ضروری ہیں، اخذ و جذب کرے۔ اس سلسلے میں آپ کا نقطہ نظر ''انتخابیت'' پر مبنی تھا۔ یعنی وہ مختلف مکاتب فکر سے خوشہ چینی کر کے اسلامی شریعت کی تشکیل جدید کے متمنی تھے۔ بحیثیت مجتہد کے وہ چاہتے تھے کہ جدید فکر کے چیدہ اور چنیدہ عناصر کو قدیم اسلامی اسلوب کا قالب عطا کیا جائے۔ عبدہ کے خیال کے مطابق مذاہب فقہ کی تفصیلات کے تحت اب اسلام اس قدر وسیع اور پر پیچ بن چکا ہے کہ اس پر اب نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اسی نقطہ نظر کے مطابق وہ فقہ اسلامی میں ترمیم کے خواہاں تھے مگر اجتہاد کا دروازہ اس طرح بھی نہیں کھولنا چاہتے تھے کہ امت اسلامیہ کا تشخص برقرار نہ رہ سکے اور اس کے اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔[۱۳] مفتی اعظم کی حیثیت سے آپ پورے مصر میں شریعت اسلامیہ کے متعلق سرکاری ''ترجمان اعلیٰ'' کی حیثیت رکھتے تھے اور ساتھ ہی حکومت کے قانونی مشیر اور نظم اوقاف کے نگراں بھی تھے۔ آپ نے متعدد فتوے صادر کئے ہیں۔ جن فتوؤں میں وسیع الخیالی اور تقلید کی گرفت سے آزادی کا رجحان نمایاں ہے۔ ان کی یہ زبردست خواہش تھی کہ اسلام اس طرح پیش کیا جائے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ جدید تہذیب اور عصری تقاضوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کا متحمل ہے۔ اس سلسلے میں ان کے تین فتوے بہت مشہور ہیں۔ پہلے فتوے کے مطابق ایک مسلمان کے لئے اہل کتاب کے ذبیحے کا گوشت

جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے دوسرے فتوے کے مطابق یورپی لباس پہننا جائز ہے۔ تیسرے فتوے کے مطابق ڈاک خانے کے سیونگ بینک کی امانت پر سود لینا جائز ثابت کیا گیا ہے۔[۱۴]

عبدہ نے شدومد سے تقلید اور جمود کی مذمّت کی ہے۔ آپ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں کہ ''میں نے سب سے پہلے ذہن کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا''[۱۵]

ان کے خیال کے مطابق ہر انسان کے اندر اشیاء کے خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ جس طرح انسان محسوسات میں خیر و شر کی تمیز کر سکتا ہے اسی طرح معقولات میں بھی خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت انسان میں موجود ہے۔[۱۶]

عبدہ کے ان اصلاحی خیالات سے ازہری علماء زبردست بیزار تھے اسی لئے ان کے ان متذکرہ بالا اصلاحی و اجتہادی کوششوں سے زیادہ مفید نتائج برآمد نہ ہوئے اور نہ ہی ان کا دیرپا اثر رہا۔ آخر ۱۹۰۵ میں آپ نے رحلت فرمائی اور آپ کے اصلاحی و اجتہادی کوششوں کو آپ کے ایک شاگرد علامہ رشید رضا نے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر شیخ محمد عبدہ کے مقابلے میں رشید رضا تجدد کے بجائے قدامت پسند ثابت ہوئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بہت وسیع کر کے عبدہ نے اسلامی فلسفے اور قانون میں ہر طرح کے جدید میلانات کے سرایت کرنے کے لئے راہ ہموار کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض پیروؤں نے سیکولرازم یعنی غیر دینی معاشرے کے قیام کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالرزاق کا نام قابل ذکر ہے جنہوں نے اپنی مشہور تالیف ''الاسلام واصول الحکم'' میں مطالبہ کیا ہے کہ فقہ اسلامی کو شہری زندگی کے ضابطے کی حیثیت سے بالکل ترک کر دیا جائے تاکہ مسلمان ''مذاہب فقہ کے وسیع دواوین'' کے بوجھ سے آزاد ہو کر ایک نئے اور ترقی پذیر معاشرے کی تشکیل کر سکیں جس کی بنیاد عقل، حکمت اور متمدّن اقوام کے تجربوں پر رکھی گئی ہو۔

سرسید احمد خان (۱۸۹۸-۱۸۱۷)

گولڈز ہیر کے مطابق مصر میں عبدہ کی اصلاحی تحریک اپنے غالب رجحان کے لحاظ سے کلامی تحریک تھی لیکن برصغیر ہند میں سرسید احمد خان کی اصلاحی تحریک ایک تمدّنی تحریک تھی جس کا کلامی مسائل سے برائے نام ہی تعلق تھا۔[۱۷]

دراصل سرسید احمد خان کی تصانیف کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک میں آپ ہندوستانی مسلمانوں کے قائد کی شکل میں نظر آتے ہیں اور دوسرے میں آپ ایک اسلامی مفکر و مصلح کا رول نبھاتے ہیں۔ حالی کے نزدیک سرسید اپنی قوم کے لئے ایک مسیحا تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد اس میں دوبارہ عزت نفس کا احساس بیدار کیا۔

درحقیقت سرسید احمد خان ایک ایسے مصلح ملت تھے جو نہ صرف اسلام کے آفاقی نظام پر غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے بلکہ اسی کو عہد جدید کے ہر چیلنج سے نپٹنے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اسلامی عقائد کے سلسلے میں سرسید کو نئے نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں خاص طور پر جدید سائنسی اکتشافات اور ان کے فلسفیانہ نتائج اسلامی عقائد کے لئے زیادہ پریشان کن چیلنج تھے۔ ان حالات میں سرسید نے عقلی استدلال سے مذہب کے معاملے میں کام لینے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تقلید کی۔ مذہبی اصلاح کے لئے ان کے دو بنیادی خیالات وہی ہیں جو شاہ ولی اللہ کے تھے۔ پہلا یہ کہ مذہبی فکر و عمل میں سلف کی تقلید کافی نہیں بلکہ ہر دور میں زمانے کے تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دوسرا یہ کہ مذہب اسلام کی تعلیم کو کل عالم انسانیت کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر عقلی انداز میں پیش کرنا ضروری ہے۔ انہیں اس حقیقت پر عقیدہ کامل تھا کہ قرآن کا معجزہ اس کی ظاہری فصاحت و بلاغت نہیں بلکہ اس کا اعجاز وہ تعلیمات و احکامات ہیں جو قانون فطرت کے عین مطابق ہیں اور ہر زمانے کے لئے نافذ العمل ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ

کائنات اللہ کا عمل اور قرآن مجید اس کا قول ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ سرسیدؔ کو ایک ایسے نمایاں اسلامی مفکر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جس نے اسلامی روایات کے اندر رہتے ہوئے مسلم امت کی مکمل اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔

علامہ اقبالؒ سرسید کی حقیقی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنہوں نے اسلام کی جدید تعیین سمت کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس موضوع پر کام بھی کیا۔ ہم سرسید کے مذہبی خیالات سے تو اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ سرسید کی بے چین روح نے ہی سب سے پہلے عہد جدید کے چیلنج کو محسوس کیا۔ پھر اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت محسوس کر کے اس کے لئے سعی بھی کی''[۱۸]

سرسید احمد خان کا یہ بھی ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو قرآن کی مدد سے سمجھنے کے عمل میں فنی تعبیر یا (Textual interpretation) کے جدید سائنٹفک اصول کی بنیاد رکھ کر اس معاملہ میں اہل التاویل کی تقلید نہیں کی بلکہ ابن حزم کے اصولوں کو اپنا رہنما بنانے کی کوشش کی۔

انہوں نے پٹنہ میں ایک لیکچر کے دوران دین اور دنیا کے گہرے تعلق کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے۔ اس طرح سے انہوں نے دین اور شریعت میں فرق کرتے ہوئے دین کو ابدی جان کر شریعت میں حسب ضرورت نئی تشریحات اور ترجیحات کی اہمیت کو واضح کیا تھا۔

دراصل آپ عام فقہا و مجتہدین کے طرز کے اجتہادات اور اجماع امت کے قائل نہیں تھے بلکہ آپ ہر ذی عقل مسلمان کو اس بات کا حق دیتے تھے کہ جن مسائل میں کوئی نص صریح

نہ ہوان میں اپنی عقل وبصیرت کے مطابق فیصلہ کرے۔ آپ کے ان تصورات کے بارے میں پروفیسر محمد عمر الدین اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ سرسید کے مذہبی فکر کا یہ مرکزی عقیدہ کہ ''الاسلام ھوالفطرۃ والفطرۃ ھی الاسلام'' آج اصولی اعتبار سے تمام مفکرین وموئیدین اسلام کے نزدیک شرفِ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اقبال، مودودی بلکہ قدیم طرز پر تعلیم پائے ہوئے حضرات علماء بھی اسلام کو دین فطرت تسلیم کرنے میں سرسید کے ہم خیال وہمنوا ہیں۔ یہی ان کے کارنامے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ سرسید نے اپنے زمانے کی شبہات اور ضروریات کے لحاظ سے اس زمانے کے مسلّمات اور معلومات کی روشنی میں اپنے اجتہادات پیش کئے ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں صرف وقتی اہمیت کی حامل تھیں لیکن بعض مستقل قدر و قیمت بھی رکھتی ہیں۔ ہمیں ان کے فلسفے اور تصانیف میں سے ان عناصر کو جو زندہ رہنے والے ہیں اور مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں، لینا چاہیئے اور ان کی بنیاد پر نئی ضروریات نئے مسائل اور نئی معلومات کی روشنی میں اسلامی فکر کو آگے بڑھانا چاہیے۔ اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے سلسلے میں ہمیں پوری سنجیدگی اور ذمے داری سے سرسید کے پیش کئے ہوئے ان اصولوں پر غور کرنا ہوگا۔ ان مسائل سے متعلق چاہیے ہم کسی نتیجے پر پہنچیں لیکن ان کی جسارت فکر، ان کے خلوص نیت اور اس راہ میں ان کی اولیت سے انکار ممکن نہیں۔''[۱۹]

ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸۔۱۸۸۸)

ہندوستان کی عظیم المرتبت شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بڑی اہمیت کا حامل

ہے۔ مرحوم آل احمد سرورؔ کے خیال کے مطابق ''سرسید احمد کی تفسیر نے مولانا آزاد کو تو بے یقینی اور تشکیک کے دھندلکے میں روشنی دکھائی مگر عام مسلمانوں نے اسے قریب قریب نظر انداز کر دیا۔''[۲۰]

مولانا آزاد کی تعلیم کسی دینی درسگاہ، کالج یا کسی یونیورسٹی میں نہیں ہوئی بلکہ ان کا علمی گھر ہی ان کی درسگاہ ثابت ہوا اور ان کے والدین ہی ان کے استاد رہے۔ اپنی بے پناہ، ذہانت قوت مشاہدہ اور روشن دماغی کی وجہ سے آپ بہت جلد علمی و سیاسی دنیا کے افق پر چھا گئے۔

آپ نے صحافت کی زندگی شروع کر کے اپنے مشہور و معروف جریدے ''الہلال'' کو ''عروۃ الوثقیٰ'' کے نمونے پر ڈھالا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کر کے آپ نے غلام ہند کو آزادی دلانا، غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کرنا اور ان کو اسلام کے اولین فرائض کی یاددہانی کرانا اپنا اولین فرض سمجھا۔ چنانچہ ''الہلال'' میں آپ لکھتے ہیں:

> ''الہلال کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ خواہ تعلیمی مسائل ہوں، تمدنی و سیاسی مسائل ہوں یا کچھ اور۔ وہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صدا صرف یہی ہے کہ ''تعالو الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم ''(۳:۵۷) اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقاداً انکار نہیں مگر عملاً یہ حال ہے کہ ''الذین قالوا آمنا بافوا ھھم ولم تومن قلوبھم ''(۵:۴۵) انہوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے ہیں لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں''[۲۱]

مولانا آزاد کے نزدیک کسی ملک اور قوم کی فلاح اور ترقی کا انحصار اس کے تعلیمی نظام

پر ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ملک کا تعلیمی نظام بہتر ہو اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتا ہو۔
تحصیل علم کے متعلق مولانا ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''علم و عمل کی راہوں میں آج قدیم و جدید کی تقسیم کی جاتی ہے لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں جو کچھ قدیم ہے مجھ کو ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لئے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں خامہ فرسائی کرتا ہوں''۔

دراصل مولانا آزاد طریقہ درس و تدریس میں قدیم کے حامی تھے اور نصاب درس میں جدید کے قائل تھے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ ہندوستان میں جو دینی مدارس ہیں وہ وقت کی نزاکت کو سمجھیں اور نصاب میں وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی لائیں مگر درس و تدریس میں قدیم طریقہ ہی کو جاری رکھیں۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ علم کے سلسلے میں آپ درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے کسی قوم و ملت کے لئے یہی چیز بہتر جانتے ہیں۔

آپ نے ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کو تعلیم اور قومی تشکیل پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ''مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیے''

مولانا آزاد نے اسلام میں تین ہمعصری اصلاحی و اجتہادی تحریکات میں خط امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اول مغرب زدہ جدیدیت تھی جس کے مقلد ''یورپی چمک دمک سے خیرہ چشم ہو رہے تھے'' اور آنکھ بند کر کے غلامانہ نقل و تقلید کے حامل تھے۔ اس جماعت میں آزاد نے سرسید احمد خان (ہندوستان) سلطان محمود اور فواد پاشا (ترکی) محمد علی (مصر) اور خیر الدین پاشا (تیونس) کو شامل کر رکھا تھا۔ دوسری جماعت میں الافغانی کی چلائی ہوئی سیاسی اصلاح، دفاع

اور آبادکاری کی تحریک تھی۔ اس زمرے میں وہ مدحت پاشا کو بھی شامل کرتے تھے۔ تیسری جماعت انؒ کے نزدیک اصلاح مذہب کی تھی۔ اس کے نمائندے شیخ صدر الدین (مسلم روس) شیخ محمد عبدہ (مصر) شیخ عبدالرحمن الکوابی اور شیخ کمال الدین القاسمی (شام) تھے۔ ابوالکلام آزاد اپنے آپ کو اس تیسری جماعت کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس جماعت کے لائحہ کار کے بنیادی اصول یہ تھے:

۱۔ شریعت اسلامیہ میں اس عالم دنیا و آخرت میں کوئی امتیازی فرق نہیں ہے۔

۲۔ مسلمان خیر الامم کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ بشرطیکہ وہ قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوں''۔

۳۔ شریعت اسلامیہ تمام الہامی شریعتوں میں مکمل ترین اور حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

۴۔ انحطاط اسلام دراصل زوال و تعطل اجتہاد اور بجائے واجبات پر ارتکاز کے شخصیات اور مذہبی دقیقہ سنجی میں الجھے رہنے کا نتیجہ ہے۔[۲۲]

مولانا نے ''تاسیس'' میں جسے وہ مذہب کی تعمیر نو سے تعبیر کرتے ہیں اور ''تجدید'' میں جو نری جدیدیت ہے اور جس کے مبلغ سرسید تھے، خطہ امتیاز قائم کیا۔ آپ اسلام کے مثالی دین ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے اس لئے اس کی اپنی ذات میں اکملیت اور جامعیت کو لابدی تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کی ضرورت تھی جو دین کی اکملیت کو ابھار کر سامنے لائے یعنی اس کی تجدید نو کرے۔[۲۳]

آپ نے جمال الدین افغانی کے ان خیالات سے اتفاق کیا کہ ''اجتہاد'' کے فرائض ترک کرنے کی ذمہ داری خلفائے بنی عباس پر عائد ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے خیال کے مطابق بین اسلامی معاشرہ یا (pan Islamic society) پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ جماعت کا کسی ایک امام یا خلیفہ کی متابعت، خلیفہ کی دعوت پر اس کا لبیک کہنا، خلیفہ کی اطاعت، ہجرت یعنی

دارالاسلام کی جانب نقل مکانی جس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں اور جہاد جس کی کئی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ جماعت کی ہندوستانی اسلامی شاخ کے لئے وہ ایک علاقائی امام یا قائد کے حق میں تھے جو عثمانی خلیفہ کے مذہبی نائب یا وائسرائے کی حیثیت رکھتا ہو۔[۲۴]

مولانا آزاد غیر منقسم ہند میں مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کو انہوں نے ''ایک عظیم گروہ'' کہا ہے ''جو اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکہ دینا ہے۔ اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی، مساوات اور برادرانہ یکجہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے''[۲۵]

انہوں نے اسلامی تشخص (Identity) پر بحث کرتے ہوئے اسلامی اور ہندوستانی تشخص کو برابر کی اہمیت دی ہے۔

عصر حاضر کی دو بڑی اسلامی تحریکات کا نظریۂ اجتہاد

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴۔۱۹۱۸) کے اختتام پر مغربی نظام کی ایک نئی لہر اٹھی۔ اس نے مروجہ مذاہب کو افیون قرار دیتے ہوئے اپنے نئے ایجاد کردہ مذہب کو آئیڈیالوجی یا نظریۂ حیات کا نام دیا۔[۲۶] اس نظریۂ حیات کی تعمیر کرنے اور اسے نافذ کرنے والی پارٹی کو مکمل طور پر سیاسی غلبہ حاصل ہوگیا۔ مسلم معاشرہ لامحالہ اس روح عصر (Zeitgeist) سے متاثر ہوا اور مسلم آبادی والے ان ممالک میں Totalitarianism کی تحریکیں ابھریں جو برطانیہ کے زیرِ نگیں ہونے کے سبب مغرب سے علمی اور ذہنی طور پر قریب تھے یعنی الاخوان المسلمون (۱۹۲۹) اور جماعت اسلامی (۱۹۴۱)۔ آگے چل کر یہ دونوں تحریکات اسلامی عالمی نوعیت کی تنظیمیں بن گئیں۔

الاخوان المسلمون: (۱۹۲۹ء)

اس تحریک کے بانی حسن البناء تھے۔ جو ۱۹۴۹ء میں شہید کئے گئے۔ انہیں یہ تحریک شروع کرنے کا خیال پہلے پہل قاہرہ میں لوگوں کی اسلام سے بے خبری اور غفلت کو دیکھ کر ہوا جب انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے صرف مسجدوں میں وعظ خوانی ہی کافی نہیں ہے اور جب یہ بھی دیکھا کہ روایتی علماء تجدّد پسندوں کی بے لگام مغرب زدگی کا سدّ باب کرنے سے قاصر ہیں تو انہوں نے یہ تحریک ۱۹۲۹ء میں شروع کی۔ دراصل شیخ حسن البناء ابتداء ہی سے ایک ایسی ہمہ گیر تحریک جاری کرنا چاہتے تھے جو عالم

اسلام کی رہنمائی کرے اور ملت کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے تمام میدانوں کو اسلامی نظریات کے تابع بنادے۔ الاخوان المسلمون ایک نہایت منظّم تحریک تھی۔ اس کے ارکان مختلف مدارج میں منقسم کئے گئے تھے۔ صف اول۔ دوم۔ ہمدرد اور فعال کارکن وغیرہ۔

اخوان المسلمون اسلامی تعلیمات کو اسلوب جدید میں پیش کرنا چاہتے تھے تا کہ یہ ثابت ہوجائے کہ اسلام بہترین مذہب اور نظام حیات ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عائد کئے جانے والے الزامات کی تردید اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کے نقطۂ ہائے نظر کے درمیان تطبیق اس تنظیم کا مطمع نظر تھا۔ آپ لوگوں نے اپنی تحریک میں خواتین کو روزِ اول ہی سے شامل کر رکھا تھا۔ اس شاخ کا نام ''اخوات المسلمون'' رکھا گیا تھا۔ ''اخوات المسلمون'' کی سرگرمیاں زیادہ تر تعلیم اور سماجی بہبود پر مرتکز تھیں۔ ان کا مقصد خواتین کو عزّت، نیکی اور عصمت وعفت کے مدارج عالیہ سے ہمکنار کرنا تھا۔ ''اخوان المسلمون'' کی تحریک میں ممتاز مفکرین اور دانشور شامل تھے جن میں عبدالقادر عودہ شہید محمد الغزالی۔ سید قطب شہید اور حسن الہیضبی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تحریک کے ممتاز مفکر سید قطب شہید نے مختلف عنوانات کے تحت کم وبیش بائیس (۲۲) تصانیف رقم کی ہیں جن میں کچھ اہم ترین تصانیف یوں ہیں: ''فی ظلال القرآن''،

''العدالة الاجتماعیه فی الاسلام، '' التصویر الفنی فی القرآن''،

'' معرکة الاسلام والرأسمالیه'' و ''نحو مجتمع الاسلامی''

اسلامی نظریۂ قانون کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''اللہ کی طرف سے جو شریعت ہمیں عنایت ہوا ہے، وہ ہر زمانے کے لئے نافذ العمل ہے البتہ فقہ قرآن وحدیث کے دائرے کے اندر رہ کر ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے کیونکہ فقہ بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں کے مطابق ارتقاء

پذیر ہے''[۲۷]

آپ عالم اسلامی کے تال میل کیلئے واحد اسلامی بلاک پر زبردست زور دیتے تھے۔ عالمی امن اور اسلام کے موضوع پر آپ نے ایک اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ''السلام العالمی والاسلام'' لکھ کر علمی دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ امن اسلام کا ایک اہم ترین مشن ہے۔ عالمی امن کے موضوع پر اُن کی یہ متذکرہ بالا کتاب ایک بے نظیر اور مایۂ ناز تصنیف تسلیم کی جاتی ہے۔[۲۸]

اخوانی تحریک کے ایک اور معروف رہنما سید حسن الہضیبی نے بھی شریعت اور موجودہ قوانین کی تطبیق کے بارے میں اپنی اس اجتہادی رائے کا اظہار کیا ہے کہ شریعت ان جدید قوانین کا مخالف نہیں ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتے نہ ہوں۔ اس بارے میں اسحاق موسیٰ حسینی بڑے عالمانہ انداز میں حسن الہضیبی کے یہ تاثرات قلمبند کرتے ہیں کہ ''مصر کے موجودہ سول قوانین بہت حد تک اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں''

مذکورہ بالا انگریزی تصنیف میں موسیٰ حسینی اخوان کے اس مرشد کا یہ فتویٰ بھی رقم کرتے ہیں۔

" The head of the State, can suspend punishment (Hadd) prescribed by the Quran, if he finds some justification for doing so"[29]

مشہور مغربی دانشور اور مبصر پروفیسر اسمتھ (W.C.Smith) اس تحریک کے متعلق ایک بے لاگ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''الاخوان المسلمون'' کو شروع سے آخر تک رجعت پسند سمجھ لینا ہمارے نزدیک غلط ہوگا کیونکہ اس میں عدل اور انسان دوستی کی بنیادوں پر ایک جدید سوسائٹی قائم کرنے کی قابل تعریف تعمیری کوشش بھی شامل ہے۔ جو قدیم روایات کی بہترین اقدار سے ماخوذ ہے۔ وہ جزوی طور پر ایک ایسی قوت فیصلہ کی حامل ہے جو اس زوال و پستی کا خاتمہ کرسکتی ہے جہاں (اس وقت) عرب سوسائیٹی پہونچ چکی ہے۔۔۔۔ یہ تحریک

(اخوان المسلمون) اسلام کو خالص بے حس اور مردہ عقیدتمندوں اور پرستاروں کی جذباتی گرمجوشی یا پیشہ ورانہ روایت پرستوں کے فرسودہ دائرہ عمل سے جو اپنے خیال وعمل میں عہد ماضی سے وابستہ ہیں ایک اُبھرتی ہوئی قوت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جدید مسائل پر اپنا عمل جاری رکھ سکتی ہے۔''[۳۰]

''اخوان المسلمون'' کی تحریک اگر اپنی صحیح اور طبعی رفتار سے آگے بڑھتی تو اس تحریک سے یقیناً بڑی امید تھی کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے کام کی تکمیل کرتی کیونکہ اس تحریک میں ایسے قدیم و جدید مفکرین و مصلحین مجتمع تھے جن میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جدید دور کے مقتضیات کے تحت اپنی اجتہادی و اصلاحی فکر سے ملت مسلمہ کے لئے شاندار مستقبل کی ضمانت فراہم کرتے۔ بلاشبہ یہ تحریک عہد حاضر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک کے طور پر ابھری تھی لیکن اس کے رہنماؤں کی ملکی سیاست میں قبل از وقت شرکت کی وجہ سے برسر اقتدار طبقے نے اس عالمی تحریک اسلامی کو اس انداز سے کچل کے رکھ دیا کہ ابھی تک یہ سنبھلنے ہی نہیں پاتی ہے۔

دور جدید کے ممتاز اسلامی مفکرین میں ڈاکٹر سعید رمضان، ڈاکٹر مصطفٰے السباعی، محمد قطب اور ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی اس تحریک سے زبردست متاثر نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی: (۱۹۴۱ء)

جماعت اسلامی اپنی ہمعصر اسلامی تحریکات میں ثروت علمی اور متانت فکری کے لحاظ سے سب سے مقدم رہی ہے بلکہ براعظم جنوبی ایشیا کی اسلامسٹ تحریکوں میں اب تک یہی تحریک سب سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی ہے۔

قدیم طرز کے علماء اور مغرب زدہ حضرات کی ناکامی کے بعد اس خلیج کو پاٹنے اور صحیح

اسلامی قیادت فراہم کرنے کے لئے سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳۔۱۹۷۹) کی قیادت میں یہ تحریک ۱۹۴۱ء سے باضابطہ طور پر معرضِ وجود میں آ گئی۔ دراصل اس تحریک کا آغاز ۱۹۳۳ء ہی سے اُس وقت ہوا جب سید مودودی نے اپنے اُردو ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں اسلامی نظام حیات کے موضوع پر باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اس وقت جدید مغربی تہذیب مسلمانوں پر جس طرح اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، سید مودودی نے ''ترجمان القرآن'' میں ان پر بطور خاص توجہ کی۔ اپنے پُرزور استدلال اور واضح ادبی اسلوب سے آپ نے اس مادہ پرستانہ فلسفے کی مؤثر تردید کی جو مسلمانوں کے اذہان کو ایک عرصہ سے مرعوب کر رہا تھا۔ اس طرح سے سید مودودی ابتداء ہی سے زندگی کے جملہ شعبوں میں جدید انداز سے اسلامی نظام حیات کی برتری ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ۱۹۳۷ء کے اواخر میں علامہ اقبال انہیں لاہور آنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ دونوں احیائے اسلامی قانون کے لئے مل کر کام کریں۔ لیکن اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ کے انتقال فرمانے کے باعث ان کا یہ مشن ادھورا ہی رہا۔[۳۱]

سید مودودی نے عصر حاضر میں اسلامی فکر پر نہایت گہرے اور مثبت اثرات مرتب کئے ہیں۔ ان کی بہترین تربیت کے نتیجے میں ہی جماعت اسلامی ایک منظم اور طاقتور ترین علمی تحریک کے طور پر منصۂ شہود پر آ گئی۔ اس تحریک نے سید مودودی کی تربیت و نگرانی میں جو لٹریچر تیار کیا ہے وہ بہت ضخیم اور وسیع ہے۔ خود سید مودودی نے متعدد ضخیم کتب و رسائل تصنیف کی ہیں جن میں ''تفہیم القرآن''، ''اسلامی ریاست''، ''پردہ''، ''اسلامی قانون''، ''تفہیمات''، اور ''تنقیحات'' قابل ذکر ہیں۔

اسلام کے دستوری مسائل پر ان کی متذکرہ بالا تصانیف میں ''اسلامی ریاست'' اور ''اسلامی قانون'' عالم اسلام میں آج کل بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ پروفیسر

خورشید احمد یہ کتابیں کئی بار کراچی سے شائع کرا چکے ہیں۔ سید مودودی تقلید و جمود کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے پرزور حامی رہے ہیں۔ اپنی تصنیفات و تقاریر میں آپ نے متعدد بار دور جدید کے تقاضوں کے تحت اجتہاد کی زبردست حمایت کی ہے۔ آپ اپنی اہم ترین تصنیف ''تنقیحات'' میں اجتہاد کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتے ہیں اور حقیقی مصلح کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اصلی رہنما اور حقیقی مصلح کی تعریف یہ ہے کہ وہ اجتہاد فکر سے کام لیتا ہے اور وقت اور موقع کے لحاظ سے جو مناسب ترین تدبیر ہوتی ہے اُسے اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس کا اتباع کرتے ہیں وہ اندھے مقلد ہیں۔ جس طریقہ کو اس نے وقت کے لحاظ سے اختیار کیا تھا اسی طریقہ پر یہ اس وقت کے گذر جانے کے بعد بھی آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ماضی میں جو انسب تھا حال میں وہی غیر انسب ہے۔ پچھلی صدی کے رہنماؤں کے بعد ان کے متبعین آج بھی اس روش پر اصرار کر رہے ہیں جس پر اُن کے رہنما انہیں چھوڑ گئے تھے حالانکہ وہ وقت جس کے لئے انہوں نے وہ روش اختیار کی تھی گذر چکا ہے۔ اب اجتہاد فکر سے کام لیکر اپنا طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔''[۳۲]

فکری جمود و انجماد کا ذکر کرتے ہوئے آپ ملت کے بہی خواہوں کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''دنیا کے حالات و رجحانات اور نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے۔ تمدن کے مسائل اور معاملات نے کتنے پلٹے کھائے مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے پایا جاتا تھا، انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہیں کی۔ نئے تعبیرات سے بے اثر رہے۔ زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی اور کوشش

یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدّت تک کامیاب ہوسکتی تھی اور ہوئی مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور معاملات رکھتی ہو وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متاثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنما اُس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی، علمی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ اس کی قیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہوجائے گی''[۳۳]

سابق ائمہ فقہ، متکلمین و مفسّرین کے تبحّر علم و فضل کے اعتراف کے باوجود آپ ان کے اجتہادات کو حرف آخر تسلیم نہیں کرتے ہیں بلکہ برملا طور پر اپنے اجتہادی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ائمہ فقہ، متکلمین، مفسرین، محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان کی جلالتِ شان سے کون انکار کرسکتا ہے؟ مگر وہ انسان تھے اکتسابِ علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ کلام اللہ و سنت رسولؐ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک متحقق ہوجاتے تھے انہی سے وہ قوانین و عقائد کے فروع مستنبط کرلیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لئے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں مگر بجائے خود منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے۔ دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد نیا کیلئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ کے قیود سے مقیّد ہوتا ہے''[۳۴]

متذکرہ بالا اقتباسات کے حوالوں سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ سید

مودودی کا ذہن جامد تقلید پرستی اور ہٹ دھرمی کے برعکس کتنا کشادہ اور وسیع تھا۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی اسی فکری کشادگی اور اصلاحی واجتہادی اسپرٹ کی طرف پروفیسر اسمتھ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بہت سے لوگ خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا دوسرے ممالک کے، نیز خواہ وہ مودودی جماعت کی تعبیر اسلام سے اختلاف رکھتے ہوں یا اتفاق، بہرحال اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اسلام کا بھی ایک اقتصادی نظام ہے۔ اسلامی سیاسی نظام بھی کوئی شئے ہے اور اسی طرح اسلامی دستور بھی دنیا میں موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ظہور اسلام کی ابتدائی دو تین صدیوں میں اسلام کے اخلاقی اصولوں کو قانون میں منضبط کر دیا گیا تھا جسے فقہ کہتے ہیں لیکن بعض مسلمانوں کے نزدیک زمانے اور رجحانات کے پیش نظر یہ فقہ بھی اب پرانی بات ہو چکی ہے اور اس میں بحالات موجودہ کوئی ہمہ گیری بھی نظر نہیں آتی۔ یہ اتنی جامد ہے کہ موجودہ زمانے میں اس کے قوانین پر عمل پیرا ہونا کارے دارد کے مترادف ہوگ۔ مودودی صاحب پہلے آدمی ہیں جو اس قانون کو زمانۂ حاضر کا ایک مثبت اور قابل عمل نظام بنا کر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک ایسے نظام حیات کی صورت میں پیش کیا ہے جس نے آج سے صدیوں پہلے بنی نوع انسان کو ہر زمانہ میں پیش آنے والے مختلف مسائل کے متعین جوابات فراہم کر رکھے ہیں۔''[۳۵]

سید مودودی مغرب کے جدید مکاتب فکر اور فلسفوں سے کافی حد تک واقف تھے اسی لئے مغربی تہذیب اور افکار کی تنقید اور اسلامی تعلیمات کی تشریح وتوضیح میں اُن کی تحریریں اعتماد اور طاقت سے پُر ہیں۔ انہوں نے اسلامی مسائل اور متکلمانہ وسیاسی مباحث پر جو پرزور

مضامین اور رسائل قلمبند کئے ہیں اس کی وجہ سے انہیں عالم اسلام میں زبردست پزیرائی حاصل ہوگئی۔ان کی غیر معمولی فکری اور عملی جدوجہد ہی کی وجہ سے جماعت اسلامی ایک وسیع عالمی تحریک اسلامی کی صورت میں وقوع پذیر ہوئی مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سید مودودی کے بعد تا ایں دم اس تحریک میں کوئی ایسی عبقری شخصیت نہیں ابھر سکی جو اپنے عہد کے فکری چیلنج کو قبول کرتی۔سید مودودی کے انتقال کے بعد ابھی تک جماعت اسلامی نہ صرف اپنا فکری کام آگے نہ بڑھا سکی بلکہ یہ جماعت اب ہر جگہ اس روایتی فکر کی طرف رواں دواں ہے جس سے بیزار ہو کر سید مودودی نے یہ تحریک بپا کی تھی۔

اسلام کی خدمت کا ایک اہم میدان یہی ہے کہ اسے عصری چیلنجوں کے تناظر میں سمجھا جائے اور فکر تازہ کے طور پر اقوام عالم کے سامنے پیش کیا جائے۔

مآخذ باب سوم

1. S.M. Iqbal, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" (Kitab Publishing House, Delhi 1974. p.7)
2. D.S. Margoliouth, art. "Wahhabiya", in Encyclopaedia of Islam, Ist ed., F. Rahman, Islam. p. 197 ff.
3. M.M. Sharief, "A History of Muslim Philosophy" art "Renaissance in Arabia, Yemen, Iraq, Syria and Lebnan" vol.II., p.1449 (Low Price Publicatin Delhi 1989)
4. S.M. Iqbal, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" p. 193.

۵۔ ڈاکٹر حسین محمد جعفری ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید''، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۵۷

6. S.M. Iqbal, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" p. 97

۷۔ ''الجمیعۃ'' دہلی ۲۲ جولائی ۱۹۲۵ء مقالہ نگار، سید ابوالاعلیٰ مودودی

8. M.M. Sharief "A History of Muslim Philosophy" art . "The Sunnusiyyah Movement" by Muhammad Khalil. p. 1469.

۹۔ ''الوحدۃ الاسلامیہ بقلم حکیم الاسلام وفیلسوف سید جمال الدین افغانی (مطبوعہ القاہرہ۔ سنہ ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۳ء۔ ص ۱۳)

۱۰۔ عروۃ الوثقیٰ کے مضمون کا اردو ترجمہ از غفار ۳۸۵ تا ۳۹۴

11. M.M. Sharief, "A History of Muslim Philosophy", p.1483
12. S.M. Iqbal, "The Reconstruction of Religious Thought in Islam", p.97.

۱۳۔ انہوں نے اسی لئے ''رسالۃ التوحید'' میں جس کا موضوع علم الکلام کے مسائل ہیں، ان امور سے تعرض نہیں کیا ہے جن سے عہد وسطیٰ کی ''جدلیاتی'' بحث پھر سے اٹھ کھڑی ہو۔ مذکورہ رسالے کی پہلی اشاعت میں وہ عقیدۂ خلق قرآن کے حامی تھے لیکن بعد کی اشاعتوں میں انہوں نے اس مبحث کو حذف کر دیا۔

۱۴۔ رشید رضا ''تاریخ الاستاذ الامام'' قاہرہ، ۱۳۶۶ء، ص ۶۴۶

۱۵۔ رشید رضا۔ ایضاً، ص ۱: ۵۵

۱۶۔ امام شیخ محمد عبدہ ''رسالۃ التوحید'' قاہرہ ۱۳۵۵ء، ص ۹۵

17. Gold Zahair "Die Richtungen Der Islamichen Koranous Legung" Laden 1920, pp. 319-320.

۱۸۔ علامہ اقبال ''اسلام اور احمدی تحریک'' انجمن خدام الدین لاہور، ۱۹۳۶ء، ص ۲۱
یہ دراصل علامہ اقبال کے انگریزی پمفلٹ یا کتابچے Islam and Ahmadism سے ماخوذ ہے جو علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کے سوال کے جواب کے ساتھ لکھا تھا۔

۱۹۔ پروفیسر محمد عمر الدین ''سرسید کا نیا مذہبی طرز فکر'' بحوالہ ''علی گڈھ تحریک'' مرتبہ نسیم قریشی، ص ۱۶۷

۲۰۔ آل احمد سرور ''اقبال کا نظریہ اصلاح و تجدد'' بحوالہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید از ضیاء الحسن فاروقی، ص ۔ ۳۷۱۔

۲۱۔ ابوالکلام آزاد۔ ''الہلال'' نمبر ۱۴۶ (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے فرمایا کہ ''ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے تو ہمیں ''الہلال'' نے یاد دلایا'')

۲۲۔ ابوالکلام آزاد، خطبات لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۱۹۹ تا ۲۰۲

۲۳۔ ایضاً ص ۲۰۷ تا ۲۰۸

۲۴۔ ایضاً ص ۲۲۰ تا ۲۳۱

۲۵۔ ابوالکلام آزاد۔ خطبات رام گڈھ، ۱۹۴۰ء ص ۔ ۱۰۳

۲۶۔ اشارہ ہے کمیونسٹ آئیڈیالوجی کی طرف۔ اقبالؒ نے پیام مشرق، ۱۹۲۳ء ص ۲۳۶ پر ''صحبت رفتگان در عالم بالا'' کے زیر عنوان کارل مارکس کا نظریہ پیش کرتے ہوئے حاشیے پر اسے ماہر اقتصادیات قرار دینے کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''اس کی مشہور کتاب موسوم بہ ''سرمایہ'' کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیئے''۔ اور ارمغان حجاز میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' (۱۹۳۶) کے زیر عنوان ابلیس کے مشیر کی زبانی مارکس کو یہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

آں کلیم بے تجلّی! آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

دراصل ''مذہب'' یہاں "Way of life" کے معنی میں مستعمل کیا گیا ہے۔ (م۔ا۔غ)

27. Sayyid Qutub "Nahwa Mujtama Islami, Beirut: Daral-Shuruq, 1975,pp 47, 50, 64

۲۸۔ روزنامہ ''العلم''، مراکش، شمارہ نمبر ۲، ستمبر ۱۹۶۶ میں مراکش کے مجاہد کبیر علال الفاسی لکھتے ہیں:
''کاش یہ کتاب یعنی ''السلام العالمی والاسلام'' میری تصنیف ہوتی''

29. Ishaq Musa al-Husaini: "Al-Ikwanul-Muslimun" Beirut (1955. p.246-47)

30. W.C. Smith: Islam in Modern History, p.161-162 (Indjan Edition 1983)

۳۱۔ اسعد گیلانی اپنی کتاب ''اقبال۔ دارالاسلام اور مودودی'' میں اقبال اور مودودی کی ایک ملاقات جو لاہور میں ہوئی تھی، لکھتے ہیں کہ پٹھانکوٹ ضلع گرداس پور کے ایک مخیّر انجینئر چودھری نیاز علی خان نے خدمت اسلام کے لئے ایک وقف قائم کیا تھا۔ اسی کے نظم ونسق چلانے کے سلسلہ میں وہ علامہ اقبال کے پاس جاوید منزل لاہور آئے۔ اُن کے ہمراہ اس وقت نومسلم محمد اسد بھی تھے۔ وہ علامہ سے اس وقف کے سلسلہ میں رہبری چاہتے تھے۔ علامہ اقبال نے انہیں اس وقت کے جیّد علمائے دین کو یہاں مجتمع کرنے کا مشورہ دیا تا کہ وہ علمائے کرام زمانہ جدید کے مطابق مسلمانوں کے مختلف مسائل کا حل ڈھونڈیں۔ مولانا مودودی کا نام چنتے ہوئے علامہ نے انہیں کہا کہ ''سردست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔ حیدرآباد دکن سے ''ترجمان القرآن'' کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اُن کے مضامین میں نے پڑھے ہیں۔ دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے وہ ضرور دعوت قبول کریں گے''۔ اسعد گیلانی کے مطابق ۱۹۳۷ء میں چودھری نیاز علی خان اور سید ابوالاعلیٰ مودودی اس سلسلے میں علامہ اقبال سے لاہور میں ملاقی ہوئے۔ اسی ملاقات کے سلسلے میں اسعد گیلانی سید مودودی کا بیان نقل کرتے ہیں کہ ''اقبال نے مجھے یعنی (مولانا مودودی) کو رائے دی کہ میں چودھری صاحب کی دعوت قبول کرلوں اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں وہاں منتقل ہوجاؤں تو وہ خود سال میں چھ مہینے وہاں قیام فرمایا کریں گے۔ میرے لئے ان کی یہ پیش کش اس قدر جاذب نظر تھی کہ میں نے بلا تامل اس کو قبول کرلیا اور مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد سے دارالاسلام منتقل ہوگیا۔ لیکن افسوس کہ دوسرے ہی مہینے اپریل میں علامہ اقبال مرحوم کا انتقال ہوگیا اور تنہا مجھے ہی وہ کام کرنا پڑا جسے علامہ اقبال اور چودھری صاحب مرحوم میرے ساتھ مل کر کرنا چاہتے تھے''

(سید اسعد گیلانی، ''اقبال دارالاسلام اور مودودی'' اسلامی اکادمی اُردو بازار لاہور ۱۹۷۸ء پاکستان، ص ۸۵تا۹۰۔)

۳۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ''تنقیحات'' مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔۱۹۹۱، ص ۱۴۳
۳۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ''تنقیحات''، ص ص ۱۸۷۔۱۸۸
۳۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ''تنقیحات'' ص ص ۱۸۹۔۱۸۸
۳۵۔ ولفرڈ کینٹول اسمتھ مترجم مشیر الحق ''اسلام دورِ حاضر میں'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی
جولائی ۱۹۸۶ء۔ص ۱۹۳